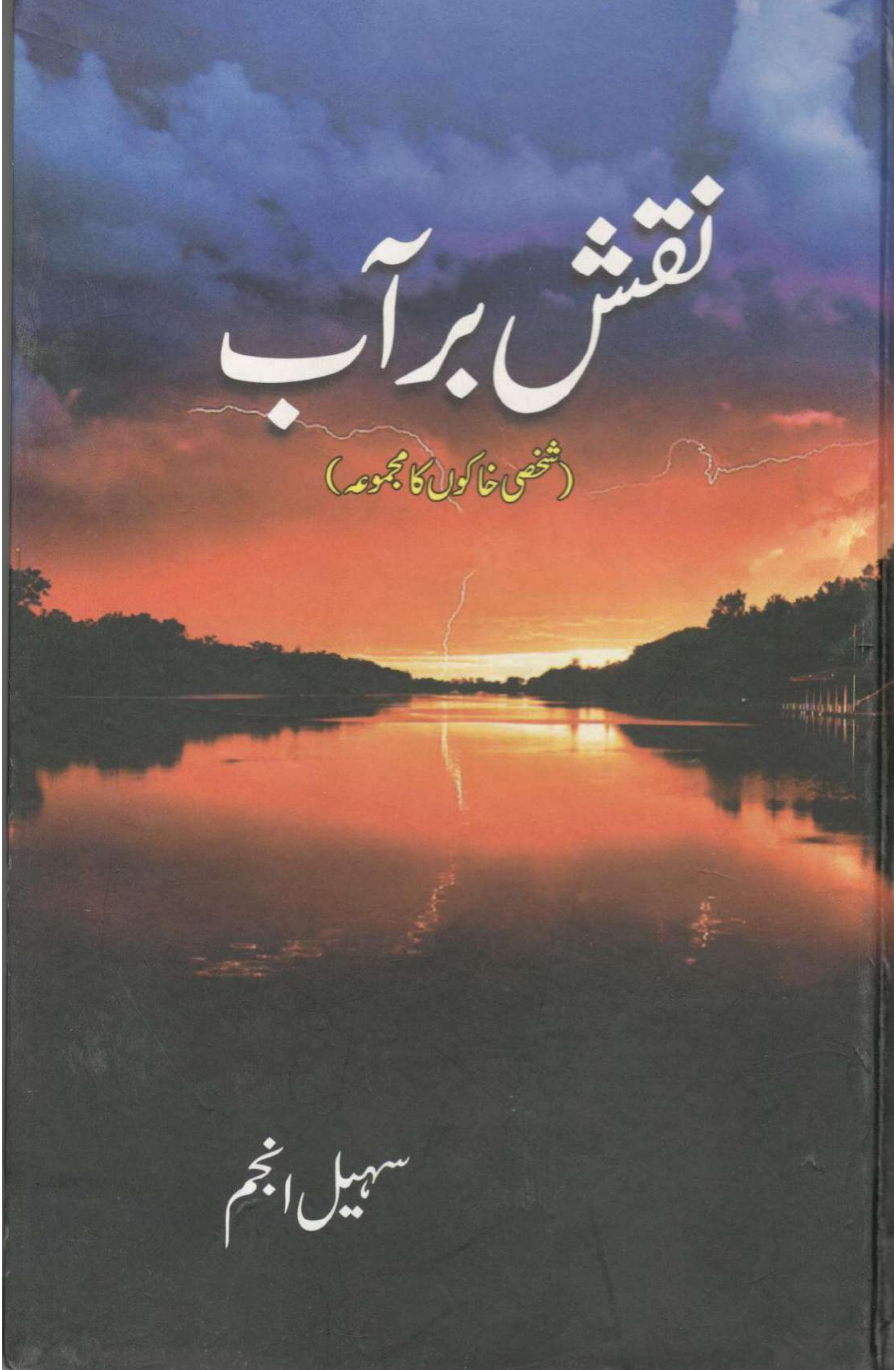
نقش برآب
(شخصی خاکوں کا مجموعہ)
سہیل انجم

نقش بر آب

(شخصی خاکوں کا مجموعہ)

سہیل انجم

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

NAQSH BAR AAB
By
SUHAIL ANJUM
Year of Edition 2015
ISBN: 978-93-5073-764-4

نام کتاب	:	نقش برآب (شخصی خاکوں کا مجموعہ)
مصنف	:	سہیل انجم
ناشر	:	سہیل انجم، A 370/6 ذاکر نگر، نئی دہلی 110025
سال اشاعت	:	2015
تعداد اشاعت	:	پانچ سو
قیمت	:	-/250 روپے
مطبع	:	عفیف پرنٹرس دہلی۔٦

ملنے کا پتہ

سہیل انجم، 370/6A ذاکر نگر، نئی دہلی 110025
M. 9818195929, 9582078862
email: sanjumdelhi@gmail.com

فہرست

☆پیش لفظ منظور عثمانی

☆دل میں اترتی کتاب راشد اشرف کراچی

☆ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

☆مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم

(شانِ کج کلاہی)

☆نواب بخش

(صبر و شکر کی مورت)

☆ حماد انجم ایڈوکیٹ

(اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے)

☆ محمود الحسن انصاری

(اردو کا عاشق ملت کا شیدا)

☆محمد عمر پردھان

(تھوڑی شرافت زیادہ شرارت)

☆محفوظ الرحمٰن

(عقیدت کی شبنم)
☆موہن چراغی
(صحافت کا چراغ)
☆ ظفر عدیم
(خانماں خراب حیات)
☆محمد یوسف خاں درانی
(ایسا شریف درانی؟)
☆عادل اسیر دہلوی
(ادب اطفال کا بے لوث خادم)
☆مولانا محمود الحسن
(نحیف جسم مضبوط عزائم)
☆پروفیسر شعیب اعظمی
(مسجد کے زیر سایہ......)

دو باتیں

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں خاکہ نگاری کے فن سے نابلد ہوں۔ اس کی باریکیوں سے ناواقف ہوں۔ اس کے اجزائے ترکیبی سے بے بہرہ ہوں۔ اس لیے میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ خاکے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ مضامین میں خاکوں کی جھلک ہو۔ اس کا فیصلہ اہل فن اور اہل نظر کریں گے کہ ان مضامین کو کیا کہا جائے۔ خاکے، سوانحی مضامین یا تاثراتی تحریر۔ بہر حال جو بھی ہے قارئین کے سامنے حاضر ہے۔

میں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس قسم کے مضامین لکھنے کی خواہش ایک عرصے سے رہی ہے۔ میں جب لوگوں کے خاکے پڑھتا تو میرے دل میں یہ خیال آتا کہ میں بھی کچھ لکھ سکتا ہوں۔ لیکن کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ جب میں نے معروف مکالمہ نگار جناب جاوید صدیقی کے خاکوں کا مجموعہ ''روشن دان'' پڑھا تو میری خواہش کو بال و پر لگ گئے۔ دل نے میرے اندر کے قلمکار سے کہا کہ قلم اٹھا لے۔ تو اگر جاوید صدیقی جیسا نہیں لکھ سکے گا تو کوئی بات نہیں، بہت سے نام نہاد خاکہ نگاروں سے تو اچھا ہی لکھ لے گا۔ لیکن پھر بھی اس کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس درمیان کافی دن گزر گئے۔ اچانک ''روشن دان'' ایک بار پھر میرے ہاتھوں میں آ گئی اور میں نے پھر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ نثر کی بہت کم کتابیں میں نے دوبارہ سہ بارہ پڑھی ہیں۔ ایسے مصنفوں میں ابن صفی نمبر ایک پر ہیں۔ دوسرے نمبر پر مشفق خواجہ ہیں اور تیسرے نمبر پر جاوید صدیقی ہیں۔

مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ جب جب میرے ذہن میں خاکے لکھنے کی خواہش بیدار

ہوتی تو کئی چہرے نگاہوں میں گھوم جاتے۔ ان میں سب سے پہلا چہرہ ہمارے گاؤں کے محمد عمر پردھان کا ہوتا۔ ان کی شخصیت میں اتنی دلکشی و دلنوازی تھی اوراس کے ساتھ ہی اتنا بانکپن تھا کہ نہ جانے کیوں ان کا خاکہ لکھنے کو میں بےچین رہتا۔ وہ ہمارے آبائی گاؤں میں ہمارے پڑوسی رہے ہیں۔ ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت میں مجھے بڑی کشش نظر آتی۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی مشاق اور ماہر خاکہ نگار ان کا خاکہ لکھتا تو مجھ سے کہیں بہتر لکھتا۔ دوسری شخصیت صحافت میں میرے معنوی استاد جناب محفوظ الرحمٰن صاحب کی رہی۔ ان پر بھی خاکہ نما لکھنے کی خواہش میرے دل میں رہی ہے۔ ایک اور شخصیت موہن چراغی کی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ان پر ایک مضمون لکھا تھا۔ لیکن یہ مضمون اس سے الگ ہے۔ اگر چہ سابقہ مضمون کے کچھ حصے اس میں ضرور آگئے ہیں۔ اس درمیان میرے والد گرامی، بڑے بھائی اور ایک بھائی اور دوست کا بھی انتقال ہو گیا۔ میں نے ان تمام شخصیات پر قلم اٹھایا اور جو کچھ بن پڑا آپ کے سامنے ہے۔

میں ایک صحافی ہوں اور صحافت اور میڈیا کے موضوع پر میری کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب ان تمام کتابوں سے الگ ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ قارئین اس کتاب پر ضرور اظہار خیال کریں۔ کتاب اچھی لگی یا بری، اس میں خوبیاں ہیں یا خامیاں، وہ جیسا محسوس کریں ویسا اظہار کریں۔ ان کی تنقید بھی میرے لیے اصلاح کا کام کرے گی۔

محتاج دعا
سہیل انجم

پیش لفظ

منظور عثمانی

مطلع صحافت پر ۱۹۸۵ میں نمودار ہونے والا انجم (سہیل) اخبار بینوں کے لیے بڑا جانا بوجھا نام ہے۔ گونا گوں موضوعات پر ان کے مضامین کی زد سے ملک سے نکلنے والا شاید ہی کوئی موقر جریدہ محفوظ رہا ہو۔ راقم الحروف کی علیک سلیک ان سے چھ سات سال قبل ہی ہوئی ہے۔ پہلی ہی دید وشنید سے اچھے بھی لگے۔ خوش اطوار، خوش گفتار اور شگفتہ مزاج۔ ایسے لوگ نظر انداز بھی نہیں کیے جا سکتے۔ چونکہ ہم دونوں ہی ''اوکھلے'' میں سر دیے ہوئے ہیں اس لیے راہے گاہے ٹکراتے بھی رہے۔ موصوف اکثر نام نہاد قلمکاروں کی مانند ''ان پڑھ'' نہیں ہیں۔ اس لیے جب بھی ملتے احقر کے کسی نہ کسی انشائیے کے حوالے سے داد تحسین سے بھی نوازتے۔ چونکہ پیشے سے ''مخبر'' ہیں اس لیے ''خلاف معمول'' باخبر بھی رہتے ہیں۔

خوشا نصیب کہ یہ دیوانۂ لوح وقلم ایک دن اچانک میری دیوار تک آ پہنچا اور اس نے اپنی تازہ ترین ضخیم کتاب ''مطالعات'' سے بھی نوازا۔ ورق گردانی سے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ آپ کی پہلی تصنیف ''بازیافت'' مطبوعہ ۲۰۰۵ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) کے بعد سے یہ ان کی پندرہویں تخلیق ہے۔ ان کے علاوہ بھی ''رحمِ طباعت'' میں تین اور کتابیں کلبلا رہی ہیں جن کی تولید سعید عنقریب ہونے والی ہے۔ بھلا ''سرعت'' کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے:

لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

چونکہ سہیل انجم سخت گیر اور محکم گیر کے قائل ہیں اس لیے انھوں نے چند دنوں کے بعد جب غریب خانہ پر دوبارہ قدم رنجہ فرمایا تو حسب سابق خالی ہاتھ اس بار بھی نہیں تھے۔ ''نقش بر

آب'' (شخصی خاکے) کا مسودہ ساتھ تھا۔ چلتے چلتے حکم صادر ہوا کہ کتاب پر ''مقدمہ'' بھی دائر کرنا ہے۔ دعویٰ اس قدر زوردار تھا کہ ہاں کرتے ہی بن پڑی۔

''نقش برآب'' ایسے بارہ مرحومین کے خاکے ہیں جو مصنف کے بیچ میں آئے جن میں سے چندان کے مستقبل پر انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ پہلے ''شان کج کلاہی'' دوسرے ''صبر وشکر کی مورت'' اور تیسرے ''اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے'' آپ کے والدمحترم جناب ڈاکٹر مولانا حامدالانصاری انجم، چھوٹے دادا نواب بخش اور بڑے بھائی حماد انجم کے پراثر اور لاجواب خاکے ہیں۔ ایک خاکہ آپ ہی کے گاؤں کے عمر پردھان کا ''تھوڑی شرافت زیادہ شرارت'' کے عنوان سے ہے جس میں عمر پردھان کے پردے میں آج کے گرگٹ صفت اور بہروپیے نیتاؤں کی خوب خوب خبر لی گئی ہے۔ اس خاکے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سہیل انجم طنز ومزاح کی طرف رخ کریں تو اس میدان میں بھی جھنڈے لہرائے بغیر نہیں رکیں گے۔ یوں بھی ان کی طبعی خوش مزاجی اور شگفتہ تحریر اس کی غمازی کرتی ہے۔

سہیل انجم ایک نابغۂ روزگار، عالم بے بدل اور ہمہ جہت شخصیت کے فرزند ہیں۔ ان کے والد ڈاکٹر مولانا حامدالانصاری انجم بیک وقت شاعر، خطیب، طبیب، صاحب طرز قلمکار، صحافی، بیباک سیاست داں اور جانے کیا کیا تھے۔ سہیل انجم میں عظیم باپ کی بہت سی خوبیاں ودیعت ہوئی ہیں۔ اپنے پیشے کے تئیں والہانہ اور مخلصانہ انہماک اور بیباکی ان کے خون میں شامل ہے۔ مضامینِ نو بہ نو کے انبار اسی تخلیقی شورش کا نتیجہ ہے جو انھیں ہر دم بے چین رکھتی ہے۔

باقی مضامین ان شخصیات پر ہیں جن سے اپنے وطن اور پھر دہلی کی صحافتی زندگی میں وہ رابطے میں آئے۔ ان میں دو شخصیات ایسی ہیں جو ان کے کریئر کو بنانے میں کافی اثر انداز ہوئیں۔ عظیم صحافی محفوظ الرحمٰن اور سہیل انجم کے رفیق کار ظفر عدیم۔ بالخصوص محفوظ الرحمٰن۔ محفوظ صاحب سے آپ خصوصی طور سے متاثر ہیں۔ ایک طرح سے محفوظ صاحب ان کے رول ماڈل ثابت ہوئے جنھوں نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی۔ شروع سے ہی سہیل صاحب محفوظ الرحمٰن صاحب کی ''بارعب شخصیت اور ہمہ شیشہ، ہمہ مینا، ہمہ جام'' کے سے مزاج سے متاثر تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے کی چاہ نے انھیں ہفت روزہ ''ہمارا قدم'' کی معقول تنخواہ کو

لات مار کر محفوظ صاحب کے بے سروسامان و بے وسائل ''اپنا ہفت روزہ'' جوائن کرنے پر مجبور کیا۔ جہاں اگر چہ انھیں بے اندازہ مالی تنگ دستی سے دوچار ہونا پڑا لیکن محفوظ صاحب کی صحبت نے ان کی فطری صلاحیت کو جلا ہی نہیں بخشی بلکہ صحافتی زندگی کو نیا موڑ بھی دیا۔ انہی کے ایما اور تجویز پر انھوں نے میڈیا کے موضوع پر اپنی پہلی کتاب کا عنوان ''میڈیا روپ اور بہروپ'' رکھا۔ محفوظ صاحب ہی کے مشورہ پر انجم صاحب نے میڈیا کو اپنا موضوع بنایا جس کے نتیجے میں میڈیا اور صحافت پر ان کی کتابیں ''میڈیا روپ اور بہروپ''، ''مغربی میڈیا اور اسلام''، ''میڈیا اردو اور جدید رجحانات'' اور ''احوال صحافت'' عالم وجود میں آئیں۔ عظیم صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط پر ان کی دو کتابیں بھی اسی جذبے کی دین ہیں۔ ان کے علاوہ ''دہلی کے ممتاز صحافی'' نامی ان کی کتاب کو دہلی اردو اکادمی نے اپنے سلسلہ مطبوعات کے تحت چھاپا ہے۔ دو اور کتابیں ''صحافت کے فروغ میں علما کا کردا'' اور ''ہندوستان میں دینی مجلّات کی صحافتی خدمات'' عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔

آج اردو میڈیا میں سہیل انجم کا نام معتبر ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ انھیں اس ڈگر پر ڈالنے والے محفوظ الرحمٰن ہی ہیں جس کے لیے اردو دنیا کو مرحوم کا ممنون احسان ہونا چاہیے۔ محفوظ الرحمٰن نے ان کی تحریروں پر کئی بار اپنی پسندیدگی کا اظہار اس طرح بھی فرمایا ''پڑھ کر ایسا لگا جیسے میں نے ہی لکھا ہے''۔ انجم صاحب کے حج نامہ ''پھر سوئے حرم لے چل'' کا سہرا بھی محفوظ صاحب ہی کے سر جاتا ہے۔

محفوظ صاحب نے سہیل انجم کی کردار سازی میں بھی بڑا اہم رول ادا کیا۔ خود ان کی ہی زبانی سنیں:

> ''ایک بار میری عدیم الفرصتی پر انھوں نے نصیحت کی کہ سہیل انجم صاحب یہ بات ذہن میں بٹھا لیجیے کہ اس لائن (صحافت) میں آپ کی جتنی رگڑائی ہوگی آپ کے قلم میں اتنی ہی چمک پیدا ہوگی۔ محنت سے گھبرائیے اور بھاگیے نہیں۔ وہ جتنی محنت آپ سے لیں آپ کیجیے۔ اس کا فائدہ بعد میں آپ کو ملے گا''۔

آگے چل کر سہیل انجم معترف ہیں:

''واقعی اس رگڑائی نے کام کرنے کی میرے اندر ایسی عادت ڈال دی کہ اگر میرے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے تو میں بیمار پڑ جاتا ہوں''۔

محفوظ صاحب نے ان کے اصرار پر ان کی کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' پر جو تاثراتی مضمون قلمبند کیا ہے اس میں وہ ان کی صحافت کی ستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''سہیل انجم نے حقائق کی تہہ تک اتر جانے کی جس غیر معمولی صلاحیت، جزرسی اور نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اگر موجودہ حالات میں بالکل ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ وہ برسہا برس تک صحافت کے خارزار میں اپنے تلووں کو لہولہان کرتے رہے ہیں۔ وقت کی چلچلاتی دھوپ میں وہ ایک مدت تک کسی شجر سایہ دار یا سائبان کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحمل، یہ قوت برداشت، ہر تلخ بات کو نرم لہجے میں کہہ ڈالنے کی غیر معمولی صلاحیت اور تنقیص کے بجائے صحت مند تنقید کی ڈگر پر چلتے چلے جانے کا جو حوصلہ ان کی کتاب کے سطور اور بین السطور دونوں میں ہی پوری قوت کے ساتھ جھلکتا ہے، غالباً انہی دنوں کی دین ہے''۔

محفوظ صاحب پر ان کا خاکہ قابل مطالعہ ہے۔ ان کی شخصیت پر اتنے جامع اور بھرپور خاکے کی شکل میں نذرانۂ عقیدت وہی شخص پیش کر سکتا ہے جس کا روم روم اس عظیم ہستی سے عقیدت کی حد تک پیار کرتا ہو۔

دوسری شخصیت جس نے ان پر چھاپ چھوڑی وہ ان کے رفیق کار ظفر عدیم مرحوم کی ہے۔ عدیم صاحب کے تئیں ان کی توصیف کے پیچھے وہ فکر کارفرما ہے جو صحافت کے بارے میں خود ان کا اپنا مطمح نظر ہے۔ دونوں کے خیال میں آج کا المیہ یہ ہے کہ آج کی صحافت ادب سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ صحافت بھی ایک ادب ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا رنگ ہو۔ عدیم صاحب کا یہ خیال ہے:

''بیشک صحافت بھی ایک ادب ہے بشرطیکہ صحافی مولانا آزاد کی صحافت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن صدمے کی بات یہ ہے کہ اردو ادب کے علمائے کرام نے

ادب پر تنقید و تحقیق کو لاد کر نہ صرف ادب سے انسانی جذبات کو چھین لیا بلکہ اس کے اثر سے صحافت بھی رفتہ رفتہ ادبیت سے محروم ہوتی چلی گئی۔صحافت میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ اس میں انسانی جذبات کی ایک موج تہہ آب موجود ہو۔ اگر صحافت کو صرف ''خبر نگاری'' یا سیاسی یا واقعاتی موضوع کو حالات حاضرہ کے تشریحی خاکے تک محدود کر دیا جائے تو یہ نتیجہ ہوگا کہ صحافت میں ادبی چاشنی ختم ہو جائے گی۔ تب صحافی کے نجی جذبات نیوز اور میڈیا کے مروجہ آئٹموں سے مغلوب ہو جائیں گے''۔

چنانچہ کم وبیش آج صحافت کی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔

سہیل انجم ایسے صحافی نہیں جو صرف نیوز ڈیسک سے وابستگی کے باعث ہی جرنلسٹ کہلاتے ہوں۔ان کے یہاں علم وآگہی ہے، وسیع مطالعہ ہے اور زبان وبیان پر بھرپور قدرت ہے۔ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی ہے اور برمحل اشعار کا استعمال ان کے مضامین کو وقار بخشتا ہے۔انسانی جذبات کی موجِ تہہِ آب ان کو معاصرین میں منفرد مقام دلاتی ہے۔

اصغر گونڈوی نے اپنے بارے میں کہا تھا:

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں جانا
اشعار میں کہتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

اسی طرح گو سہیل انجم سے ملنا یقیناً خوشی کی بات سہی، لیکن ان کو اگر دیکھنا ہے تو ہر جینوئن قلمکار کی طرح وہ اپنی تحریروں میں نمایاں نظر آئیں گے خصوصاً زیر نظر خاکوں میں۔ پڑھ کر دیکھیے یہ خاکے ایک طرح سے شفاف آئینہ ہیں جن میں سہیل انجم کی بھرپور شخصیت جھلکتی نظر آئے گی۔یہ خاکے بیک وقت آپ بیتی، باپ بیتی اور جگ بیتی ہیں۔اس پر مستزاد ان کی بصیرت افروز تشریحات اور ذاتی نقطۂ نظر۔گویا اس مختصر سی کاوش کو آسانی سے آل ان ون (All In One) کہا جا سکتا ہے۔

سہیل انجم کی ''سریع القلمی'' دیکھ کر مشہور نقاد، محقق اور تخلیق کار جناب وہاب اشرفی سے متعلق ایک لطیفہ یاد آ گیا۔آپ نے اپنی متعدد تصانیف کے بارے میں کسی محفل میں یہ انکشاف

فرمایا کہ میرے قلم سے نکلی ہوئی کتابوں کا وزن مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ بات ہمارے درویش صفت مزاح نگار جناب اسرار جامعی کے پلے پڑ کر یوں ہوگئی:

سمینار میں جب کہا اشرفی نے
سنیں سامعیں جو میں کہتا ہوں سچ ہے
لکھیں میں نے اتنی کتابیں ادب کی
کہ ہے وزن جن کا زیادہ ہی مجھ سے
سنا جامعی نے تو بولے کہ بیشک
ہوئے آپ اپنی کتابوں سے ہلکے

ہماری بھی سہیل انجم کے لیے رشک آمیز دعا ہے کہ وہ اتنی کتابیں لکھیں جو ان کے وزن سے کئی گنا بڑھ جائیں لیکن ان تخلیقات کی وجہ سے وہ ہلکے نہیں بلکہ اور بھاری ہو جائیں۔ (آمین)

قارئین کو ہماری صلاح ہے کہ وہ ''نقش برآب'' ضرور پڑھیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس کا مطالعہ نقش برآب نہیں بلکہ نقش برسنگ ثابت ہوگا۔

دل میں اترتی کتاب

راشد اشرف، کراچی

خاکہ نگاری کی تاریخ کے بارے میں معروف ادیب اور خاکہ نگار خاطر غزنوی لکھتے ہیں ''اردو میں خاکہ نگاری کی روایت ہمیں قدیم تذکروں میں ملتی ہے۔ پرانے تذکرہ نگار شعرا کے بارے میں عام طور پر چند گنی چنی سطریں لکھا کرتے تھے۔ اردو کے تذکرے فارسی زبان میں ہی ہوا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اردو کے قدیم ترین تذکروں میں خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ ''گلشن گفتار'' اور افضل بیگ کا کشال کا ''تحفتہ الشعراء'' قابل ذکر ہیں۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ۱۱۶۵ء ایک نہایت اہم سال ہے۔ اس سال میر نے اپنا مشہور و معروف تذکرہ نکات الشعراء تالیف کیا تھا''۔

خاطر غزنوی نے جدید دور کی خاکہ نگاری کے آغاز کا سال ۱۹۴۶ء کو قرار دیا ہے۔ جبکہ ۱۹۳۹ء میں چراغ حسن حسرت کی ''مردم دیدہ'' شائع ہو چکی تھی جو خاکہ نگاری کی صنف میں ایک انتہائی اہم مقام رکھتی ہے۔ اسی طرح ۱۹۴۱ء میں سید عابد حسین نے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے گیارہ ریڈیائی خاکوں پر مشتمل کتاب ''کیا خوب آدمی تھا'' شائع کی تھی اور اس کے دو برس بعد ۱۹۴۳ء میں بشیر احمد ہاشمی نے ''گفت و شنید'' کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس سے قبل فرحت اللہ بیگ نے ''نذیر احمد کی کہانی'' اور ''دلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' میں اور رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں فن خاکہ نگاری کو ایک نمایاں مقام عطا کیا تھا۔ جون ۱۹۴۶ء میں پروفیسر شجاع احمد خاں زیبا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں قلمی خاکے کے عنوان سے ایم اے کا مقالہ تحریر کیا تھا۔ بعد ازاں اس صنف ادب میں پاک و ہند میں چند ایک مقالے لکھے گئے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ابھی اس میدان میں تحقیقی کام کی بہت گنجائش باقی

ہے۔

پروفیسر افتخار اجمل شاہین کے بقول ''اب تک لوگ سوانح عمری، شخصیات نگاری، سیرت نگاری، یادداشتوں اور مرقع نگاری کو خاکہ نگاری کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔ ہم خاکے کی مختصر تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہ وہ مختصر مضمون ہے جس میں خاکہ نگار اپنے مطلوبہ خاکے (شخصیت) کے تمام خدوخال نمایاں نہیں کرتا بلکہ مخصوص الفاظ اور مخصوص انداز میں اس شخصیت کے ان ہی خدوخال کی تصویر پیش کرتا ہے جس سے اس کے مخصوص اور مطلوبہ ظاہری اور باطنی نقوش موثر انداز میں ابھر کر سامنے آجائیں''۔

پروفیسر شاہین کی بیان کردہ اس کڑی تعریف کو کسوٹی مان کر شخصی خاکوں کے مجموعوں کو پرکھا جائے تو بہت کم مجموعے ایسے ہوں گے جو اس تعریف پر پورے اتریں گے۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض مجموعوں میں خاکہ نگار نے اپنی ذات کو بھی نہایت تفصیل سے پیش کیا ہے اور خاکے سے زیادہ ان میں سوانحی عنصر نمایاں ہو چلا ہے۔

پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شخصی خاکہ نگاری کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ مختلف لکھنے والوں نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور خوب دلجمعی سے لکھا ہے۔ چند مثالوں میں عبدالرزاق کانپوری، مالک رام، جگن ناتھ آزاد، بیگم انیس قدوائی، انیس چشتی، ڈاکٹر اعجاز حسین، کشمیری لال ذاکر، نند کشور وکرم، شمیم حنفی، اطہر پرویز، عابد سہیل، عارف جمیل، علی جواد زیدی، غلام رضوی گردش، پروفیسر اطہر صدیقی، ماہ منیر خان، محمد ثناء اللہ عمری، حکیم امامی، شرف الدین ساحل، مرزا جعفر حسین، نسیمہ تراب الحسن، معصوم مرادآبادی، انور ظہیر خان، باقر مہدی، اسلوب احمد انصاری، اشفاق حسین، ایم طیب انصاری، مجتبیٰ حسین، منور رانا، پروانہ ردولوی، جگر بریلوی، حامد اللہ ندوی، حسن الدین احمد، حفیظ نعمانی، خواجہ غلام السیدین، رام لعل، سید محمد حسنین، امان اللہ خان شیروانی اور مظفر گیلانی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اور اب خاکہ نگاری کی صنف ادب میں ایک اہم اضافہ کرتی، فن خاکہ نگاری کے بنیادی تقاضوں پر پوری اترتی، مذکورہ بالا جید حضرات کی فن خاکہ نگاری سے متعلق کلیدی بیانات سے میل کھاتی، زیر نظر کتاب ''نقش برآب'' اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ سہیل انجم نے تحریر کردہ

ہر خاکے کے کلیدی کردار کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ لیکن قریب سے ان شخصیات کا قد انھیں اور بھی نکلتا ہوا نظر آیا ہے۔ شاید یہی بات ان کرداروں کو مرکزِ توجہ بنانے کا جواز ہے۔

کتاب میں شامل تمام شخصیات کا انتخاب مصنف کے ذاتی تعلقات اور ان کی پسند کے مطابق ضرور ہے لیکن ان سے متعلق جو لکھا گیا ہے، کھل کر لکھا گیا ہے۔

اس موقع پر راقم کو ڈاکٹر شمیم ترمذی یاد آرہے ہیں جنھوں نے ایک کتاب کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''لگتا ہے کہ یادیں جس ترتیب سے ذہن میں آتی چلی گئیں، مصنف بلا کم و کاست لکھتا چلا گیا۔ اِن رواں دواں تحریروں سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ مصنف نے نظرِ ثانی کا تکلّف بھی نہیں کیا مبادا تحریر کا فطری بہاؤ متاثر ہو''۔

''نقش برآب'' مذکورہ بالا تعریف پر یقیناً پوری اترتی ہے۔

یہاں ڈاکٹر ترمذی کا وہ بیان بھی نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

''آخر یاد ہے کیا؟ پہلا خیال تھا کہ یاد محض انسانی ذہن کے پردے پر متحرک تصویروں کی کمنٹری ہے جو ذہن اور زبان کے درمیانی فاصلے کو کم کر دیتی ہے اور کمنٹری سننے والا شخص، دوسرے کا ذہن پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن کمنٹری تو ہمیشہ ایک سیدھی لکیر پر چلنے والی شے ہے اور یہ بات یاد کو بے لچک اور بے رس بنانے والی ہے جبکہ یادیں ایسی نہیں ہوتیں۔ پھر سوچا کہ یاد شاید fantasy ہوتی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کیونکہ یاد کا تعلق تصور و تخیل سے نہیں، حقیقت سے ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی یادوں کو تصوراتی البم بنا کر پیش کرتے ہیں، وہ یادوں کے حقیقی بیان سے گریز کرتے ہوئے یادوں کی تخلیق میں لگ جاتے ہیں جو کسی طور بھی درست نہیں۔ اب میں نے سوچا کہ یادوں کو کمنٹری کی تہمت سے بچانے اور انھیں تخیّلی مرصع کاری سے دور رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یاد کو ایسی کیفیت کہا جائے جس میں انسان ماضی کو romanticize

کرتا ہے اور یادوں کو ادبی لمس دینے والا فن کار، دلچسپ اور دل پذیر اسلوب میں، دَوری ترتیب سے بے نیاز ہوکر، ماضی کے اُن منتخب واقعات اور کرداروں کو ضبطِ تحریر میں لاتا ہے جو آج کے انسان کو جینے کا حوصلہ دیں، جو ایجابی اقدار کی قندیل سے حال کی تاریک راہوں کو روشن کردیں‘‘۔

سہیل انجم کی اس کتاب میں شامل پہلا خاکہ ’’شان کج کلاہی‘‘ ہے۔ یہ مصنف نے اپنے والدمحترم ڈاکٹر مولانا حامدالانصاری انجم پر لکھا ہے۔ یہ ایک دل گداز تحریر ہے۔ راقم کی نظر سے مختلف لکھاریوں کے اپنے والدین پر لکھے کئی خاکے گزرے ہیں۔ مگر زیرتذکرہ خاکہ کچھ الگ ہی ڈھنگ سے لکھا گیا ہے۔ ایک بیٹے نے اپنے خوددار باپ کی زندگی کی جیسی عکاسی کی ہے، اسے پڑھ کر دل سے ڈاکٹر انجم کے لیے بے اختیار دعائے مغفرت نکلتی ہے۔ یہی ایک کامیاب تحریر کا وصف ہے۔ جو دل کو چھو جائے، جو آنکھ کو نم کردے۔

کتاب میں شامل زیادہ تر خاکے ایسی شخصیات پر لکھے گئے ہیں جو عام انسان ہیں، ہمارے آپ کے جیسے۔ دوران مطالعہ یہ لوگ ہمیں اپنے چاروں طرف چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ کہنے کو ایک عام آدمی......مگر وہ جن سے زندگی جلا پاتی ہے۔ جینے کا حوصلہ بڑھتا ہے۔

خاکہ جتنا سادہ ہو، اتنا اچھا۔ زیب داستان سے جتنا گریز برتا جائے، اتنا بھلا۔ راقم الحروف نے ’’نقش برآب‘‘ کے مطالعے کے دوران یہی محسوس کیا۔

’’صبر وشکر کی مورت ‘‘، ’’اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے‘‘ اور ’’تھوڑی شرافت زیادہ شرارت‘‘ بھی عام لوگوں کے خاکے ہیں۔ ان کی سطر سطر دل میں اترتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں صلے کی پرواہ، نہ ستائش کی تمنا۔ یہ کہنے کو تو مصنف کے اقربا ہیں مگر کیا یہ میری اور آپ کی کہانی نہیں ہے؟ ایک عام آدمی کی کہانی۔ خدا نہ کرے کہ ہم اور آپ خود کو ’’خاص‘‘ لوگوں میں شمار کریں۔ ایسا کرنے سے، ایسا ہونے سے انسان اپنا آپ کھو بیٹھتا ہے۔

کتاب میں شامل ایک خاکہ ’’عقیدت کی شبنم‘‘ بھی ہے۔ اسے راقم نے نہایت دلچسپی سے پڑھا اور محظوظ ہوا۔ مذکورہ خاکے میں نہ صرف سہیل انجم کی صحافتی زندگی کی جدوجہد کی ایک

واضح شکل ابھر کر سامنے آتی ہے بلکہ دوران ملازمت ان کے ساتھیوں کی شخصیتوں سے، ان کے رویوں سے بھی پردہ اٹھتا ہے۔ مذکورہ خاکے میں سہیل انجم ان سبھوں کو تیز روشنی میں لاتے ہیں۔

میں بوجوہ دیگر خاکوں پر بات نہیں کرنا چاہوں گا۔ ان میں شامل ہیں محمود الحسن انصاری، ظفر عدیم، محمد یوسف خاں درانی، عادل اسیر دہلوی، مولانا محمود الحسن فیضی اور پروفیسر شعیب اعظمی کے خاکے وتذکرے۔ وجہ سیدھی سی ہے۔ قاری اور کتاب کے درمیان زیادہ دیر حائل ہونا کیا کوئی مناسب بات ہے؟ آپ خود ہی فیصلہ کیجیے۔

zest70pk@gmail.com

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس جہان فانی میں اک تغیر کے سوا کسی چیز کو ٹھہراؤ نہیں، کسی شے کو استقلال نہیں۔ کون ہے جو اس کے دستبرد سے محفوظ ہے، کون ہے جو اس کی زد پر نہیں۔ انسان تو انسان عہد بھی فنا ہو جاتے ہیں، تاریخیں بھی مٹ جاتی ہیں۔ ایک عالم کو حیران کر دینے والے کارنامے زینتِ طاقِ نسیاں بن کر خود صورت حیرت بن جاتے ہیں اور اپنے ہنر میں طاق مانے جانے والے بے ہنری کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز انسان اپنے عہدوں سے ''عہدِ وفا'' باندھنے کے باوجود جب تغیر کے نشانے پر آتے ہیں تو ان کے بھی نام و نشان مٹ جاتے ہیں اور ان کے عہدوں کے بھی۔ جب وقت کی آندھی چلتی ہے تو وہ فلک بوس عمارتیں جن کو دیکھنے کے لیے سر سے ٹوپیاں گر پڑتی تھیں، ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ جو بہت جی دار ہوتی ہیں وہ کھنڈروں کا قالب اوڑھ لیتی ہیں اور سیاحوں کے لیے نشان عبرت بن کر زندہ رہتی ہیں۔ جن بادشاہوں کی فتوحات کتابِ وقت کا سرنامہ ہوتی تھیں انھیں تاریخ کے اوراق پر بھی ثبات نہیں ملتا۔ جنگ میں بہادر دشمن کا پتا پانی کر دینے والی آبدار تلواریں زنگ کے ہاتھوں شرمسار ہو کر پانی پانی ہو جاتی ہیں اور عجائب گھروں میں بزدلوں کے لیے بھی تماشہ بن جاتی ہیں۔ ہاں وہ نقوش مندمل نہیں ہوتے جن میں خون جگر کی آمیزش ہو۔ ان نفوس قدسیہ کی یادیں نہیں مٹتیں جو نفس کے نہیں بلکہ مالک النفس و آفاق کے غلام ہوں۔ ان سروں کی شانِ کج کلاہی نہیں جاتی جو صرف خالق حقیقی کے آگے جھکنا جانتے ہوں کسی اور کے آگے نہیں۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم
(شانِ کج کلاہی)

فروری ۲۰۱۳ء کے پہلے ہفتے میں ابا کی طبیعت بگڑ گئی۔ بڑے بھائی جناب حماد انجم صاحب ایڈووکیٹ نے فون کر کے اطلاع دی اور کہا کہ فوراً گھر آجاؤ، ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ۷ فروری بروز جمعرات ظہر سے قبل دہلی سے گھر پہنچا۔ برآمدے کے باہر راستے کے کنارے دھوپ میں تخت بچھا ہوا تھا جس پر ابا لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے پہنچ کر سلام کیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے خیریت پوچھی۔ انھوں نے 'الحمدللہ' کہا۔ وہ بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ رک رک کر ہلکی آواز میں سائیں سائیں کر کے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے بھائی آصف ہلال انجم اور ہمارے بہنوئی عبد القادران کو دوا پلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانچ منٹ کے بعد ابا نے مجھ سے پوچھا: ''آپ کون ہیں؟''

''سہیل ہوں، دلی سے آرہا ہوں''۔

ایک بار پھر انھوں نے مصافحہ کیا، مسکراتے ہوئے کیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ کیا۔ کافی دیر تک ہاتھ پکڑے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے قبل گاؤں کے ہی ایک ڈاکٹر انور علی صاحب ان کو گلوکوز چڑھا رہے تھے جو اس وقت روک دیا گیا تھا۔ کچھ دوائیں بھی دی تھیں۔ جسم پر جگہ جگہ بڑے بڑے پھپھولے پڑ کر پھوٹ گئے تھے۔ منہ میں بھی بری طرح چھالا پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے کوئی چیز حلق سے نیچے نہیں جا رہی تھی۔ آصف ہلال نے بتایا:

''دو تین روز سے ابا نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ حلق سے نیچے کوئی چیز نہیں جا رہی ہے۔